ارے او جیگھری

سائرہ رضا

سائرہ رضا

کچہری بجی تھی۔ چارپائیوں پر مرد بیٹھے تھے اور ان سے ذرا دور زمین پر عورتوں کا گروہ تھا۔ اس میں ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ وہ سب زمین پر بیٹھی تھیں۔ کچھ بہت بڈھیوں نے چہرے کھول رکھے تھے۔ ان کے بیٹھنے کا مخصوص انداز تھا۔ گھٹنے سامنے کھڑے رکھ کر ان پر کہنیاں ٹکا لیتیں اور ہاتھ اوپر کی جانب اٹھا کر آپس میں جوڑ لیتیں۔ گفتگو اگر سنی نہ بھی جا رہی ہو تو دور کھڑے کسی بھی شخص کو ہاتھوں کی حرکت سے موضوع معلوم ہو سکتا تھا۔ کبھی تاسف سے ہاتھ ملتیں، کبھی وہی جڑے ہاتھ ماتھے سے ٹکا لیتیں اور سر گھٹنوں میں دے دیتیں۔ کبھی سر اوپر آسمان کی سمت اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھر کے اوپر والے سے رحم مانگ لیتیں۔ بے نتیجہ اوطاق جب ختم ہوتی تو ان ہی ہاتھوں کو جھاڑ کر اپنی راہ لیتیں۔

اب بھی بڈھیوں کے چہرے اوپر تھے اور وہ نیم وا ہونٹوں سے مردوں کی کچہری سن رہی تھیں۔ جوان عورتوں کے چہرے گھونگھٹ میں چھپے تھے۔ بول کچھ نہ رہی تھیں، سن سب رہی تھیں۔ پاس ہی ننگ دھڑنگ کمزور سوکھے بچے کھیل رہے تھے۔ ماؤں کے اس گروہ کے گرد طواف کرتے تھے۔ آپس کی لڑائی ذرا سنگینی اختیار کرلیتی تو جھٹ اپنی اپنی ماؤں سے لپٹ جاتے۔ مائیں کبھی چمکار لیتیں، کبھی دھتکار دیتیں۔

سر پر تپتا بے رحم سورج... اور ریت پر اس بے فکری سے بیٹھی تھیں جیسے کسی ایرانی غالیچے پر براجمان ہوں مگر وہ سب تپش آشنا تھیں... یہ تو معمول کی بات تھی۔ اس میں کیا نیا۔

صحرا کی ریت اپنے مزاج میں انوکھی تھی۔ دن کو گرم ترین اور رات کو ٹھنڈی ٹھار۔

ماؤں کی چھاتیوں کو چوستے بچے سیری حاصل نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ پوری جان لگا کر دودھ کھینچتے مگر کہاں سے۔ ماؤں کے پیٹ بھرتے تو دودھ تیار ہوتا نا۔ یہاں پیٹ بھر سیری تو دور سوکھے حلق میں قطرے ٹپکانے جتنا پانی بھی نایاب ہو رہا تھا۔

ناکامی پر لاغر بچے جیسے جنونی ہو جاتے۔ وہ بعض دفعہ بہت زور سے ماں کی چھاتی کو اپنے ایک، دو دانتوں سے چبا ڈالتے۔ یا پھر اپنا سر زور، زور سے بغل میں مارنے لگتے۔ مگر ان میں سے کچھ اتنے نحیف ہو چکے تھے کہ وہ اس طرح کا ردعمل بھی نہ دے پاتے۔ ان کے لیے رونا بھی محال تھا۔ بلی کے بچے جیسی چیاؤں کی سی آواز میں احتجاج کرتے تو بہت غور سے کچہری سنتی ماں چونکتی اور بچے کا رخ بدل کر اسے دوسری چھاتی سے لگا دیتی کہ ادھر اگر کچھ قطرے ہوں... بچہ کو کچھ تو میسر آئے۔

اب تو گائے بکریوں کے تھن بھی سوکھ گئے تھے۔ دودھ کہاں سے آتا۔ سوکھی جھاڑیاں اور ڈنٹھل تک ختم ہو گئے تھے۔ ذخیرہ کیا ہوا، سوکھا چارہ بھی بس ختم ہونے پر تھا۔ معصوم صورت بھولے بھالے یہ جانور اپنے

پرانے ساتھیوں کے پنجر کے پاس سے نظر چرائے گزرتے تھے کہ کل کو وہ۔۔۔ بھی۔۔۔ تو۔۔۔ آہ۔

اللہ کا نظام اللہ ہی جانے۔ تھر کی ریت پر انسان اور جانور بھوک پیاس سے نڈھال تھے۔ وہیں گدھوں، چیلوں، کووں کی سیری کا یہ عالم تھا کہ بھرے پیٹ کی غنودگی سے اونگھتے۔ سرحد پار سے اڑ اڑ کر آتے۔ جگہ جگہ ان گنت مردہ جانوران کی خوراک تھے۔

ہر سو سوکھا پڑا تھا۔ ہونٹ، زبان، آنکھیں۔۔۔ کھیت، کھالے۔۔۔ کنویں، پنڈت نند داس کی دی جانے والی اطلاع نے بھگتوں کے دل جلائے تھے۔ اب کچھ دن سے نہ تو پرساد چڑھا۔۔۔ اور نہ اب دیا جلانے کو تیل رہا۔ صرف گھنٹی بجا کر دیوی کے آگے ہاتھ باندھ کر وہ کتنی ہی دیر کھڑے رہے۔ پراتھنا کے لیے بہت کچھ تھا مگر ہونٹوں سے اک شبد بھی نہ نکلا۔

یعنی اب مندر میں دیا بھی نہ جلا۔

بھوکے پیاسے انسانوں کے دل پر آرے چل گئے۔ ایسی بدحالی۔۔۔ آہ۔۔۔ دیے کا کیا۔۔۔ دیا جلانے والے مرنے کو ہو گئے تھے۔

بے حد دکھ بھرے ان پلوں میں ہنسی کی قل قل پر سب ہی چونکے تھے۔ شوخ رنگوں کے گھاگھرے پر لمبا گھونگھٹ گرائے سر پر مٹکے اٹھا کر آتی لڑکیاں۔۔۔

سب مرد و زن کی نگاہیں واپس پلٹیں اور مایوسی سے جھک گئیں۔ بڑے دنوں سے خبر تھی پانی کا ذخیرہ بس اختتام کو ہے۔۔۔ لیکن ابھی۔۔۔ آج سب نے لڑکیوں کی چال ہی سے بھانپ لیا تھا۔ صرف ایک مٹکے میں پانی تھا۔

اتنی بدحالی کے زمانے میں بھی یہاں آپا دھاپی نہیں تھی کہ چھینا جھپٹی کرتے اپنے تینوں مٹکے بھر کے اپنا گھر پورا کرتے۔ سب نے کسی کی بھی ہدایت کے بغیر تنبیہہ کے بنا ایک ایک مٹکا بھرا تھا۔ آج کا دن اس پر گزارا کرتے۔ کل کے لیے ایک اور لے آتے۔ اگر ابھی ہی وہ بھر لاتیں تو کل کیا کرتیں۔

لڑکیاں چندیل کے لیے کچہری کے آگے رک کر اپنی جھونپڑیوں کی جانب چلی گئی تھیں اور ان سب میں امرکلا نہیں تھی۔

امرکلا کی ماں لمبا گھونگھٹ نہیں نکالتی تھی۔ وہ دوپٹے کا ایک کونا دانت میں داب کر پردہ کرتی۔ اس کی پیشانی چھپی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے کسی کی بھی نگاہوں میں آئے بغیر رام چند کو دیکھا کہ اس کی لاڈلی اسی کے لاڈ پیار کے کارن من مانیاں کرتی ہے۔ ماں کی حد نگاہ ٹیلے تک تھی اور پانی کا کھالا ٹیلے کے پیچھے تھا۔ وہ آجاتی تو ماں کچھ پکانے کا بندوبست کرتی۔ وہ کیونکر پیچھے رہ گئی۔ ماں کے اندازے صد فی صد درست نہیں تھے۔ مگر بہت سارے امکانات موجود تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ سب چھوکریوں کے ساتھ ہی نکلی تھی۔ سب کے قدموں میں اب پہلی سی تیزی اور ترنگ نہیں رہی تھی۔ پانی بھرنے کے لیے جانا ایک سماجی رابطہ تھا جیسے۔۔۔ وہ میلوں دور ننگے پیر چلتی جاتیں۔۔۔ کبھی کسی نے اس کام کے لیے نہ تو تھکاوٹ کا اظہار کیا تھا نہ بیزاری کا۔ یوں جاتیں جیسے مذہبی ارکان پورے کرتے ہوں۔

بغیر تھکے۔۔۔ شاداں فرحاں نپے تلے قدم اٹھاتیں۔ سر پر مٹکے، نہ کمر لچکتی، نہ پیر اکھڑنے دیتیں کہ مٹکا گر کے پھوٹے اور پانی جیسی انمول نعمت۔۔۔ بانجھ ریت کی ہوس کا شکار ہو جائے۔ ریت پانی کو پلک جھپکنے میں اپنے اندر سمو لیتی تھی۔ نشان بھی نہ چھوڑتی اور پانی کوئی گرانے کی چیز ہے۔ توبہ۔۔۔ توبہ۔

راند کیشن چھوریاں جیسے گونگی ہونے لگی تھیں۔ سوکھے کے زمانے میں اور ہریالی کے زمانے میں بڑا فرق تھا۔ نہ تو وہ ایک دوسرے پر پانی اچھالتیں، نہ کوئی تھری لوک گیت گاتیں۔ ایک سناٹے کی سی کیفیت میں گھری دن بدن کم ہوتے پانی کو تکتیں۔ جہاں سے اب مٹکے بھرتی تھیں۔ جہاں کھڑی ہوتی تھیں۔ وہ جگہ بھی واڑ کا عین درمیانی حصہ تھا۔ سوکھے کا یہی حال رہتا تو کچھ دن بعد یہ جگہ بھی راستہ بن جاتی اور کوئی نہ مانتا کہ کبھی پانی کا بہت بڑا ذخیرہ رہا تھا۔ ایسا ہی کرتی تھی تھر کی یہ ریت۔۔۔ نام و نشان تک مٹا ڈالتی۔

واڑ پر آج ویسے ہی خاموشی اور سناٹے کا ماحول رہا۔ سب کی سب بہت صدماتی کیفیت میں گھری پانی کے اس ذخیرے کو دیکھتی تھیں۔ جواب شاید چند روز تک ہی۔۔۔ سوکھا تو ہر سال ہی پڑتا تھا۔ تھر کی زندگی کا معمول تھا مگر اس بار۔۔۔

تھری منہ اٹھا کر آسمان کو تکتے رہے جہاں سورج سینہ تانے آب و تاب سے چمکتا تھا۔ روشن چمک دار دن۔۔۔ نیلا شفاف آسمان۔۔۔ تھر کی زمین چٹخ گئی اور تھریوں کی جلد بھی۔۔۔

وتھار خالی پڑے تھے۔ دھراڑ (چرواہے) واندو (فارغ) ڈھور ڈھگو پکی پکھی (جانور، پرندے) پیاس پیاس چلانے لگے تھے، مرنے لگے تھے۔

بارو بکھو بکھ کرتے۔

اب میلوں دور جا کر بھی پانی نہیں تھا۔ کنویں تھے ہی نہیں، جو تھے وہ سوکھ گئے، یہ آخری ذخیرہ تھا جو بس اپنے اختتام کو تھا آج یا کل۔۔۔ بس۔۔۔

چھوکریاں بہت نامراد و اداس لوٹی تھیں۔ باتیں بھی کرتی آئی تھیں اور ہنسی بھی تھیں۔ مگر وہ ترنگ نہیں تھی۔ باتیں مایوس اور ہنسی زخمی زخمی سی۔۔۔ اسی ایک مٹکے سے سارا دن گزارنا تھا اور گزارے کا مطلب صرف کھانا بنانا اور پانی پینا۔

امرکلا کو بھی ماں نے جلد آنے کی ہدایت کی تھی مگر ہدایات بھول کر اپنی مرضی سے چلنا اس کی فطرت تھی۔ ماں کی لاکھ پھٹکاریں بھی اسے بدلنے سے قاصر تھیں۔ ماں کے اپنے مسائل تھے تو امرکلا کے اپنے۔۔۔

وہ لاپروا تھی، منہ پھٹ بھی۔۔۔ نصیحتیں اس پر اثر نہیں کرتی تھیں۔ باپ کی لاڈلی تھی۔ وہ ماں کی مار کے بیچ آہنی دیوار بن جاتا۔ بچپن سے لمبی تھی، ساتھ کی سکھی سہیلیوں سے بڑی دکھائی دیتی اب چودھویں کے سن میں آکر دور سے آتی ایک بیاہتا عورت دکھائی دیتی۔

وہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم عمروں سے یکدم کٹ گئی۔ کچھ فطرتاً سب سے الگ تھی۔ باقی لڑکیاں اسے چھوٹا سمجھ کر منہ نہ لگاتیں۔۔۔ مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کی اپنی ہی دلچسپیاں تھیں۔ جو دوسروں کے لیے قطعاً "احمقانہ پن تھا۔

اب بھی وہ چھوکریوں کے جلو میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے رکنے پر باقیوں نے اسے پکارا تھا۔ وہ متوجہ ہی نہیں تھی۔ مٹکے اتار کر زمین پر رکھے اور خود ریت پر جھک گئی۔ تب باقی کی لڑکیاں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اس کے چری (جھلی) ہونے کا کہہ کر آگے بڑھنے لگیں کہ اب وہ اپنی مرضی ہی کرے گی۔ پہلے سے اس کی ماں چولہے کے پاس سر پر ہاتھ رکھے اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

مگر امرکلا کوئی ایسے ہی تو نہیں رکی تھی۔ کتنے دنوں بعد یہ منظر دیکھا تھا اس نے۔ وہ ریت پر بیٹھے بیٹھے ہی دور تک دیکھنے لگی۔ وہ کچھ ٹٹول رہی تھی نظروں ہی نظروں میں۔۔۔ یہ پنجوں کے نشان تھے۔ مور کے پیروں کے نشان۔۔۔ امرکلا نے پہلی نگاہ ہی میں بھانپ لیا تھا۔ یہاں سے تین مور گزرے ہوں گے۔ اس کے ہاتھ میں مور کا کھمب تھا۔

تھر کی خشک سالی سب کو کھا گئی تھی۔ جانداروں کو ان کی ہنسی کو، خوشیوں کو گنگناہٹ کو اور رقص کو۔۔۔ موروں نے کب سے ناچنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے ہی وبا سے وہ آدھے سے بھی کم رہ گئے تھے۔ جو باقی ماندہ تھے۔ وہ نجانے کہاں چھپ کر جا بیٹھے تھے۔ صحرا کا حسن مور۔۔۔ صحرا کی تھرک مور۔۔۔ صحرا کا رنگ مور۔۔۔ اور مور۔۔۔ مر رہے تھے۔۔۔ مر چکے تھے۔

اب تو ناچتے ہی نہیں تھے بھول گئے تھے۔ مگر جب بھی کھمب پھیلا کر جھومتے تھے، بے خود ہوتے تھے۔ تب رقص کے جنوں کے عالم میں۔۔۔ کھمب چھڑ جاتے۔ تھر کے باسی کسی بھی ویرانے میں کسی جگہ

پر جب کھمب گرے دیکھتے تو سمجھ جاتے' یہاں موروں نے محفل سجائی تھی۔ یہاں جھومے تھے' مدہوش ہوئے تھے۔

اور یہی کھمب اگر پنجوں کے نشان کے ساتھ کسی راستے پر پڑے دکھائی دیتے تو تھرواسی جان لیتے' یہاں سے مور گزرے ہوں گے۔ صحرا کی خاکستری ریت پر بہار کے دنوں میں جگہ جگہ یہ کھمب پڑے دکھائی دیتے تھے۔ انہیں چُن لیا جاتا اور مندروں' مزاروں میں ان سے جھاڑو بنا کر پھیری جاتی اور کتنا عرصہ ہوا مور نہ رقص کرتے تھے' نہ کہیں آتے جاتے۔۔۔ نجانے کہاں منہ چھپا کر پڑے تھے۔

امرکلا کو وہی کھمب ملا تھا اور ساتھ پنجوں کے نشان۔۔۔ سبز کاسنی نیلا سیاہ سنہرا پر۔۔۔ اس نے ان نشانوں کو دور تک جانچا اور پھر دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی نقشِ پا پر چلتی گئی۔ مٹکے دور پڑے تھے اور وہ آگے بڑھتی گئی۔

ایک اور کمھب۔۔۔ کچھ قدم اور دو مزید۔۔۔ مٹکے بہت دور رہ گئے۔ اس کے ہاتھوں میں کھمب بڑھتے جا رہے تھے۔ امر کے چہرے پر ایک خوشی اور جوش بھی بڑھتا جاتا تھا۔ اتنا آگے آنے کے بعد اب نشان ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ یعنی مور یہیں کہیں تھے اور وہ اسے نظر بھی آگئے۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ یہ تین مور تھے۔ دو ڈیل (مورنی) اور ایک مور ڈیل چونچ مار کے نجانے سخت چٹخی زمین سے کچھ نکالنا چاہ رہی تھی۔ مور سر گھما کر اپنی گردن پر مسلسل ٹھونگے مار رہا تھا۔

ان سے پرے ہو کر بیٹھی ایک ڈیل کبھی چونچ سے اور کبھی پنجوں سے اپنا جسم کھجلاتی تھی۔ وہ کسی بیماری کا شکار ہو کر نیم جان لگتی تھی۔

گھنے رنگین پر جو برسات کے دنوں میں پشت پر کسی چادر کی طرح تن جاتے تھے۔ کسی تاج کی طرح کھر جاتے تھے۔ کسی شان سے بچ جاتے تھے۔ زمین پر ان کے پیچھے اب گھسٹتے تھے۔ جیسے مور اب ان کا بوجھ سہار نہ پاتے۔

امرکلا کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کچھ پر اس کے پیروں پر گرے تو وہ چونکی۔ اس کا دل بھر آیا۔ رونے کی خواہش ابھری' مگر یہ بھی کہاں ممکن تھا۔ تھرواسیوں کے بھی تو آنسو خشک ہو چکے تھے۔ وہ پیروں کے بل بیٹھ کر کتنی ہی دیر موروں کو دیکھتی رہی' جنہیں اس کی موجودگی سے فرق نہ پڑا تھا۔

نجانے کتنی دیر بیٹھی رہتی۔ ٹن ٹن کی آواز پر چونکی یہ ڈھنگے گاڈیں کی آواز تھی۔ لگتا تھا کوئی شہر سے آرہا تھا۔ وہ چونکی۔ جب آئی تو پھری بجی تھی۔ ساتھ ہی ماں بھی یاد آگئی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے نڈھال سی اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

بہت صابر تھے تھرواسی۔۔۔ بہت شاکر تھے۔ مگر امر کلا کی ماں نے جب اسے بہت طویل انتظار کے بعد خراماں خراماں آتے دیکھا اور ہاتھ میں مور کھمب۔۔۔ سارا منظر آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

وہ اتنی دیر سے آنے کے بعد۔۔۔ ماں کو خود کا منتظر پا کر بھی مجال تھی' جو ذرا بھی تیز ہوئی ہو۔ مٹکا چولہے کے پاس رکھ کے جھونپڑے کے اندر چلی گئی۔

"ارے۔۔۔" ماں کو پتنگے لگ گئے۔ اندر گھسی ہی کیوں۔۔۔ اور نکلی کیوں نہ اب تک۔

"او چھمکری۔۔۔ اری او چلولی" اس کی آواز پاٹ دار تھی۔ جواب نہ ملنے پر وہ بکتی جھکتی اندر گھس گئی۔ وہ کھمب بہت احتیاط سے سنبھال رہی تھی۔ جہاں بہت سے پر پہلے ہی رکھے تھے۔

"منھنجو نالو امرکلا اے ماں!"

"ہاں ہاں دیکھی تیری کلائیں۔ (فنکاریاں) باپ نے نام تو رکھا ریڈیو سے سن سن کر۔ نام کا اثر آگیو۔ چھوکری پورا ریڈیو بن گئی۔ تو ادھر وائر پر گانا گا رہی تھی"

امرکلا نے لب بھینچ لیے۔

"گانا نئیں تھا ماں' پر اتھنا تھی کہ اے ٹھاکر جی! اب تو مینہ برسا دے۔"

وہ واقعی لوک گیت گا رہی تھی' جس میں تھر کی پیتا کا ذکر تھا۔ دکھ۔۔۔ آنسو۔۔۔ انتظار۔۔۔

امرکلا کا باپ ریڈیو کا شوقین تھا۔ بغل میں داب کر رکھتا۔ یہاں سگنل بڑی مشکل سے ملتے تھے۔ وہ اپنے شوق کی خاطر ٹیلے پر چڑھ کر سنتا۔

ماں کو جتنی چڑ تھی اس شوق سے۔۔۔ آگے دھی کے اندر بھی آگیا۔ بچپن کی تو خیر تھی' پر اب وہ بڑی ہو رہی تھی۔ مگر عقل ٹکوے سے بندھی تھی۔

ماں گھونگھٹ نکالنے کو کہنے لگی تھی۔ اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ وہ کھلے منہ سے پھرتی۔ جہاں ماں کو نظر آجاتا۔ وہ گھونگھٹ نیچے کھینچ دیتی۔ ماں ادھر ادھر ہوتی گھونگھٹ پلٹ دیتی۔ رسی کودتی۔ اندھا دھند بھاگتے ٹکرانے کا تو ثانی نہیں۔ سب سے بڑھ کر جو قابل گرفت بات تھی۔ وہ ماں کا ہاتھ نہ بٹاتی تھی۔

ماں سگھڑ زال (سلیقہ مند) تھی۔ اس کا سلیقہ قابل دید تھا۔ سینے' کڑھائی کرنے میں ماہر تھی۔

اور دھی۔۔۔ امرکلا جیسی نکمی۔۔۔ ماں اسے کبھی نام سے نہ پکارتی۔ اس نے اپنی مرضی کے بہت سے نام رکھ چھوڑے تھے۔ جس وقت جی چاہتا اسی سے پکارتی۔

"تو کمھب جوڑتی رہی۔" ماں کا لہجہ آج ٹوٹا سا تھا۔ "پتا تھا میں پانی بنانے کو انتظار میں تھی۔"

"ماں! اتنے دنوں بعد تو پکھی دیکھے۔ دل نہ رہا ماں۔۔۔ ڈھور مرنے کو ہو گئے' پکھی نجانے کدھر کو اڑ گئے۔ بس دیکھا تو دل کیا دیکھتی رہ جاؤں۔"

"اور اب تو نجانے کتنا وقت لگ جائے گا پکھی کو چھوڑ گھر سنسار کو دیکھنے کے لیے بھی۔" ماں کا لہجہ بھی کھویا کھویا سا ہو گیا۔

"کیا مطلب ہے ماں؟"

"گوتم آیا بیٹھا ہے' اس نے سب کو۔۔۔" ماں کا گلا رندھ گیا۔ وہ آگے بول ہی نہ سکی۔ امرکلا کی سب سمجھ میں آگیا۔ گوتم کے آنے پر سب ایسے ہی افسردہ ہو جاتے تھے۔ وہ بات ہی ایسی کرتا تھا جو کسی کو قابل قبول نہ تھی۔

"تو آنے دے ماں۔۔۔ ہر بار ہی آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ یہاں کون ہے جو اس کی سنتا ہے۔" اس نے برا سا منہ بنا کر بے پروائی سے کہا۔ "بس سب اور ای بیٹھے رہیں گے' مرتے رہیں گے۔ ابھی پکھی ڈھور مرے ہیں۔ ابھی کچھ دن بعد میں اور تم بھی مریں گے گوتم کا کیا ہے۔"

"اری چری۔۔۔" ماں تڑپی اور دو ہتڑ رسید کر کے اسے بھی تڑپا دیا۔

"جانے لگے ہیں سب اودر ذلت کروانے۔۔۔ ابھی پانی کا بندوبست کرنے کے بعد باندھنے لگے ہیں سب سامان۔ ایسی سنجائی (مفلسی) اوپر والا کسی کو نہ دے۔ جھونپڑے کے رہا کو کیسے گھر سنسار چھوڑ کر جائیں' مگر اب جانا پڑے گا۔ کب تک پارو کو مرتا دیکھیں۔ آہ۔۔۔"

وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ آنسوؤں نے گلا گھونٹ دیا تھا۔

"ایں۔۔۔ ماں۔۔۔" امرکلا نے ماں کی ادھوری بات کو پورا کا پورا سنا اور جب سمجھا تو اچھل پڑی۔

"ایں ماں سچ۔۔۔ اسیں مٹھی ونیندا؟ سچی ماں۔۔۔"

حیرت کی چیخ خوشی میں بدل گئی۔ وہ بے ساختہ ماں سے لپٹ گئی۔ ماں رونا بھول گئی۔ لمحے کا قصہ تھا۔ ماں سمجھ گئی اور پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کی دونوں چوٹیاں جکڑ لیں۔

"اری چھمکری۔۔۔ او چلولی۔۔۔ اے ٹھاکر جی!"

امرکلا پٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پانی' دھوپ' گرمی' تپش جھلساتی ریت' بیماریاں' بنیادی انسانی ضروریات کی عدم دستیابی۔ یہ تھرواسیوں کے عام مسائل تھے اور یہ مسائل بہت سے مسئلوں کا کارن تھے۔ جو زندگی کو مشکل ترین بنا دیتے تھے مگر ان

تمام سے پرے۔

غریب صورت۔۔۔ فقیر حالت والے ان انسانوں کا ایک اور سب سے اہم مسئلہ ان کی خودداری 'انا' عزت نفس اور قناعت پسندی تھا۔ وہ صابر و شاکر انسان تھے۔ تھوڑے پر گزارہ کرتے اور توکل سے بارش کا انتظار کرتے۔ اپنی پونجی پر اکتفا کرتے۔ لیکن شاید یہ قانع و صابر انسان اللہ کو بہت پیارے تھے۔ سو ان پر ہر پل آزمائش کے در کھلتے رہتے اور وہ ہر بار اس پل سے گزر جایا کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھار ایسا وقت بھی آتا جب گزرنا جھیلنا ناممکن ہو جاتا جیسے کہ اس بار۔

سوکھا ہر سال پڑتا تھا۔ عادی تھے تھر کے مکین۔۔۔ تیاریاں کرکے رکھتے۔ غذا ذخیرہ رکھتے۔ ایک دانہ ان بھی ضائع نہ کیا جاتا۔

وہ موسیٰ کی قوم تھی۔ جس نے من و سلویٰ ٹھکرا کر لہسن' پیاز اور مسور مانگی۔ لہسن' پیاز میں برائی نہیں۔۔۔ مگر من و سلویٰ کو کون ٹھکراتا ہے۔ یعنی کفران نعمت۔

مگر تھر کے مکین نعمتوں کو سنبھالنا جانتے تھے۔ ہریالی کے زمانے میں بھی ان کے ہاتھوں میں کبھی سوراخ نہ ہوا' نپے تلے قدم' نپے تلے ہاتھ۔۔۔

سبزیاں سکھا لیتے۔ برسات کے دنوں میں جب واڑ بھرے ہوتے اور انسان اور جانور زمین سب ہری بھری ہوتی۔ تب جانوروں کے پاس چرنے کے لیے بہت چارہ ہوتا۔ جب پیٹ بھر کے چارہ کھاتے تو خود بھی صحت مند گھومتے اور دودھ بھی مٹکے بھر بھر ملتا۔

دودھ بیچا جاتا کہ رقم ہاتھ آئے اور دیگر ضروریات پوری کی جاسکیں۔ ادھار اتاریں جائے۔ فصلیں کھڑی کی جائیں۔ شادیاں کی جائیں۔ سوکھے کے زمانے کے سارے خواب سبزے میں پورے کیے جاتے۔

دودھ بیچنے کے بعد بھی بچ رہتا (بڑی بڑی ٹیٹرا پیک کمپنیز کے نمائندے بڑا ٹرک لے کر آتے تھے اور دودھ خرید کر لے جاتے۔)

عورتیں گھروں میں دہی جماتیں۔ مکھن' لسی اور گھی۔۔۔ دہی کو ململ کے کپڑے میں باندھ کر لٹکا دیتیں۔ ہر جھونپڑی کے باہر یہ پوٹلیاں صاف دکھائی دیتیں۔ دہی کا پانی ٹپک جاتا اور ایک سفید گولا سا پاس رہ جاتا۔ اسے سکھا لیتیں۔ سوکھ جاتا تو سنبھال کر رکھ لیتیں۔ سوکھے کے زمانے میں ذخیرہ کیے گولے باہر نکال لیتیں۔ پتیلی میں پانی کے ساتھ گولے کو گرم کرتیں۔۔۔ دہی دوبارہ تیار۔۔۔ اس کے ساتھ سوکھی روٹی کھا کر اوپر والے کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔

مرچیں سکھا لیتے۔ کونڈی میں رگڑ کر روٹی کے ساتھ شکم سیری۔۔۔ ڈھیروں ڈھیر شکر گزاری۔

روٹی پر نمک رکھ کر سیر ہو کر کھاتے۔ نعمت پر اتنے ممنون ہوتے کہ ایک ٹانگ پر کھڑے رہ کر الحمدللہ بولیں۔۔۔ کہو تو ساری رات۔۔۔

تعلیم نہیں تھی۔ دنیاوی تو پتا نہیں۔۔۔ دینی بھی بہت کم۔۔۔ قرآن پڑھنے والے موجود تھے' سمجھنے والے کم۔

مگر کبھی کسی نے نعمتوں کو جھٹلایا نہیں۔ مسلم ہوں یا ہندو۔۔۔ تھرواسی ناشکرے نہیں تھے۔

قناعت پسندی گھٹی میں پڑی تھی۔ شکر گزاری فطرت۔ مگر بھوک سے بلکتے بچوں کو کب تک دیکھتے پچکارتے' بہلاتے۔۔۔ تھوڑے ڈھیٹ بھی تھے۔ یہ مشکل مرحلہ بھی سر کر لیتے۔

مگر بھوک سے مرتے بچوں کو دیکھنا۔ اب ناممکن ہو گیا تھا۔

بھوک سے' بیماری سے۔ جھگڑتے بچے اور اب تو بیماریوں نے ہر کس و ناکس پر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا ذخیرہ کی گئی اجناس کسی حد تک موجود نہیں۔ مگر خوراک تیار کرنے کے لیے پانی ختم ہو چکا تھا۔ پانی زندگی کی پہلی ضرورت ہے۔ پانی درحقیقت زندگی ہے۔

مٹھی شہر کے آگے اور پیچھے دونوں جانب دو تین سو دیہات تھے۔ کچھ میں بارش ہو گئی تھی۔ وہاں اتنی

بدحالی نہیں۔۔۔ مگر جہاں نہیں ہوئی تھی۔ دو' تین برس سے وہاں کا حال۔۔۔ اف۔۔۔

امرکلا کا گوٹھ بہت پرے تھا۔ گاؤں بھی کیا تھا۔ سرحد سے کچھ پہلے جھونپڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا کسی ٹیلے سے چڑھ کر دیکھتے تو یوں لگتا جیسے کسی نے کٹوروں کو اوندھا کر دیا ہو۔

حکومت کی طرف سے جب امدادی کارروائیاں شروع ہوئیں۔ تب اس میں بھی چھینا جھپٹی تھی۔ آپا دھاپی۔۔۔ کسی کو ایک بھی نہ ملتی' کسی کو ضرورت سے زیادہ' بدنظمی سی بدنظمی۔۔۔ امداد ہر کسی کے لیے تھی یکساں مگر یہاں بھی اقرباپروری ہو جاتی۔ پہلے حکومت کی امداد پہنچی اور فوج آگئی' پھر مختلف این جی اوز۔۔۔ سیاسی تنظیمیں ادارے فعال ہو گئے۔ میڈیا چلانے لگا۔

اب اتنا ڈھیر لگ گیا تھا اور سی کے لیے آنے والوں کا کہ کتنی مشکل۔۔۔ مگر ان کا بھی ایک مسئلہ تھا۔ یہ مٹھی شہر کے نزدیک رہتے۔۔۔ وہاں نہ جاتے جہاں بجلی نہ ملے اور جہاں موبائل کے سگنل کام نہ کریں۔ وہیں تک جاتے جہاں تک سڑک جاتی۔ اور سڑک وہاں تک جاتی جہاں تک ٹھیکے دار اور وڈیرے کی نظر اور جیب جاتی' بھلے سے نہر میں جائے۔۔۔ یا بھاڑ میں۔

امرکلا کے گوٹھ تک کوئی سڑک نہیں جاتی تھی۔

اس نے خشک سالی اور بدحالی کے قصے اپنے بڑوں سے۔۔۔ سن رکھے تھے لیکن اپنی چودہ برس تک کی زندگی میں کبھی ایسے عالم کو جھیلا نہیں تھا۔ مگر اس بار یہ سب بہت ہولناک تھا۔ اس نے کبھی شہر بھی نہیں دیکھا تھا۔ شہر کی باتیں ضرور سنی تھی۔ بدین شہر اور مٹھی شہر اور کراچی۔۔۔

منھنجا مولا۔۔۔ کراچی تو قسمت والوں کو دیکھنے کو ملتا تھا۔

وہ اتنی نصیب والی کب' مگر بس مٹھی ہی دیکھ لے۔۔۔ اور بجلی بھی ہے اور ریڈیو جیسا بجنے اور چلنے والا ٹی وی' ریڈیو سے تو صرف آواز آتی ہے۔

ای وطن! تنھنجا چمن شل پیا وسن
گل تڑن پونر امڑن' میلا مچن
تڑپن' [illegible] تراتین' سبزا چمن
ساٹکین جاسپ لهن' رنج و محن

(اے وطن تیرے چمن ہمیشہ آباد ہوں' پھول کھلیں بھنور جمع ہوں۔ میلے لگتے رہیں' ریگستان تر ہوں' ٹھنڈے ہوں' سبزے اگتے رہیں' دیہاتیوں کے ختم ہوں سب رنج والم)

گوتم جب بھی آتا تو ایسی مٹھی گولی لاتا جو امرکلا تو امرکلا اس کے ماں' بابا نے بھی کبھی نہیں کھائی تھیں۔

گوتم امرکلا کے دور کا رشتہ دار تھا۔ اس نے مٹھی میں رہنے والے ماما کے گھر رہ کر پڑھائی کی اور شہر میں ملازم ہو گیا۔

وہ اس بار کے سوکھے میں پچھلے سال بھی جب بارش نہ برسی گن سب کو کہتا رہا کہ اس کے ساتھ چلیں۔۔۔ امداد ملتی ہے تو سوکھا گزار لیں۔۔۔ پھر بارش کے بعد لوٹ جائیں۔ مگر سوکھے کے خوف سے کوئی گھر سنسار چھوڑتا ہے؟ گوتم تو چری ہے چری' مگر اب موت کے خوف سے گوتم کی اس بار کی پیشکش ٹھکرانا بے وقوفی تھی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بچہ۔۔۔ مر رہا تھا۔

قحط زدہ۔ خراب پانی مسلسل پینے سے دانت زرد رنگ کے۔ کھال جیسے کسی نے سکھانے کے لیے تیز دھوپ میں ڈال دی ہو' اکڑی' چٹخی' پھٹی۔

سب سوچتے امداد کیسے ملے گی۔ کیا قطار میں کھڑا ہونا پڑے؟ باری لگنے کے لیے۔۔۔ وہ لوگ خود سے آکر کیوں نہ دے جاتے۔ ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ اگر کسی نے جھڑک دیا تو۔۔۔ یا فقیر سمجھ لیا تو؟

سرپنچ نے سوچا۔۔۔ وہ گوٹھ کا سب سے بڑا ہے۔ ٹیلے پر کھڑا ہو کر دائیں جانب جو ساری زمین ہے' وہ اس کی ہے۔ کوئی کیا کہے گا کہ وہ امداد لینے والوں کی قطار میں ہے۔ اتنی زمین کا مالک۔

امرکلا کا ماما تو سوچ رہا تھا۔ جوانی کے زمانے میں ایک بار سوکھا پڑا تھا تو مجبوراً جانا پڑا گندم کے گودام پر امداد

کے لیے۔ رش کے باعث دھکا لگا تو گر گیا۔ رنگین پگڑ زمین پر گر گیا۔ کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ مگر اس لمحے کی یاد آج اتنے برس بعد گالوں کو دہکا دیتی تھی۔ لیکن تاؤ اب ٹانگوں سے معذور ہو گیا تھا۔

لڈی (نقل مکانی) کے وقت اسے اس کے پوتے نے کندھوں پر اٹھالیا۔ سرپنچ کبھی اجازت نہ دیتا۔ اس کی پوتی مرچکی تھی اور اکلوتا پوتا شدید بیمار تھا۔ علاج مل جاتا تو اس کی نسل بچ جاتی۔ نام لیوا کہ بیٹا مرے تو دو سال گزرے۔

☼ ☼ ☼

اونٹ گاڑی بیل گاڑی اور پیدل سفر۔۔۔

مٹھی شہر پہنچنا اتنا مشکل تھا اتنا لمبا سفر۔۔۔ تھکے ہارے اجڑے بچھڑے پیاسے بیمار لوگ۔۔۔ کچھ گھبرائے نظریں چرائے۔۔۔ آس نراس میں گھرے یہاں پہنچ کر ڈھارس بندھی۔۔۔ اتنے لوگ۔۔۔ اگلے ہی پل دل گھبرا گیا کیا انہیں وہ سب مل سکے گا، جس کے لیے گوتم انہیں لے آیا ہے۔ مگر گوتم ادھر بڑی چیز تھا۔

بیماروں کو اسپتال میں بھرتی کرلیا گیا۔ ایک بستر پر تین تین کو جگہ ملی۔

دکھی پریشان حال انسان پیٹ بھر کھانا کتنے دونوں بعد ملا۔ یہاں کھانے کے لیے بعض جگہ ہنگامہ بھی ہوگیا۔ مگر گوتم نے انہیں ایک پکی عمارت میں ٹھہرایا تھا۔ ایک اسکول تھا، پکے کمرے۔۔۔ پنکھے، فرنیچر۔۔۔ گراؤنڈ۔۔۔ سب سہولیات۔۔۔ مگر نہ استاد۔۔۔ نہ شاگرد۔۔۔ تنخواہیں ہر ماہ بینک سے ملتی تھیں نا۔

یہ گوتم کے اپنے گوٹھ واسی تھے، رشتے دار تھے۔ وہ انہیں سب کچھ دلا دینا چاہتا تھا۔ بد نظمی تو تھی۔ بعض اوقات چیز بعضوں کو بہت زیادہ مل جاتی۔ بعض یہاں بھی ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ سب سے بڑا مسئلہ خودداری تھا۔ اٹھ کر جاکر ہاتھ آگے کرکے زبان سے مانگنا ضمیر پر کوڑوں کی مار جیسا تھا۔ اب اتنی آپا دھاپی میں کون ڈھونڈ کر بصد احترام اشیا دیتا۔

مگر گوتم کے تعلقات کی وجہ سے تین ٹائم کا کھانا خود بخود پہنچ جاتا اور آنے والی ہر امداد فوراً" مل جاتی۔ یہاں تنگی نہیں تھی۔

وہ سب اسکول میں رہتے تھے۔ مگر گوتم کے گھر بھی گئے۔ گوتم کی پتنی سوہاسی امید سے تھی۔ شادی کے بارہ سال بعد۔۔۔ گوتم کے ہاتھ کا چھالا بنی ہوئی تھی۔ وہ امرکلا و دیگر کی طرح گھاگھرا نہیں پہنتی تھی۔ شلوار قمیص اور اوڑھنی لینے کا انداز بھی جدا تھا۔ نہ اس نے شانوں تک بھر بھر چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ شہرن تھی، وہ پکی شہرن۔۔۔ اس کے باقی زیورات بھی بہت نازک اور کم تھے۔ ناک میں کوکا تو تھا ہی نہیں۔ کھڑے ہوکر کھانا بناتی تھی، کپڑے دھونے کی مشین کا ین رکھا تھا۔ پلاسٹک کا ڈبا۔ بیچ میں لگی چرخی گھومتی تھی اور کپڑے لش لش۔۔۔

صاف ستھری لیٹرین۔ ٹونٹی میں آتا پانی۔۔۔ گوتم کی بیوی رسوئی گھر میں کھڑی ہوتی کھانا پکاتی جاتی، برتن دھوتی جاتی، واہ کیا عیش تھے۔

گھر کی سجاوٹ شہری تھی، رنگین کرسیاں صوفے۔ امرکلا ہر شے کو تحیر سے دیکھتی ڈرتے ڈرتے چھوتی۔ وہ سب فقط ملنے گئے تھے اور امرکلا کا واپس آنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ ایسا گھر اور طرز زندگی تو اس نے دیکھا ہی نہ تھا۔ سورگ جیسی دنیا۔۔۔ وہ گوتم کی بیوی کے ہاتھ پیر دیکھتی، جو بہت ملائم لگتے۔

اسے گوتم کا گھر بہت اچھا لگا۔ بہت۔۔۔ زیادہ اچھا۔

اور اسے گوتم بھی اچھا لگا۔ اتنا اچھا کہ اس کی پتنی سوہاسی زہر لگنے لگی۔ وہ پینٹ شرٹ پہنتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو فون بھی ہوتا تھا۔ وہ اس میں باتیں کرتا تھا اور اس میں فوٹو بھی بنتی تھی۔

گوتم کا بڑا نام تھا ادھر اور وہ اپنے گوٹھ واسیوں کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے بھاگا پھرتا۔۔۔ امداد کی تقسیم میں بھی لاٹھی اور بھینس والا معاملہ ہوگیا تھا۔

وہ جائز ناجائز سب کام کرتا۔ امرکلا کے لیے یہ نئی دنیا تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس ویران دنیا سے ایک نئی آباد دنیا کی طرف نکلی تھی۔ مٹھی شہر کے رنگ آسائشیں، سہولتیں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔

آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔

اگر جو لندن، امریکا، دبئی یا کراچی نکل آتی تو چٹ سے گر کے پٹ سے مرجاتی۔ ہاتھ جھاڑو کہانی ختم۔ مگر۔۔۔ امرکلا زندہ تھی اور کہانی کے بہت سے پنے ابھی پلٹنے کو باقی تھے۔ پھڑپھڑا رہے تھے۔

بدحالی بڑھتی جارہی تھی اور بحالی کی تمام کوششیں اونٹ کے منہ میں زیرہ تھیں۔ پہلے ان سب کو یہاں آنے کی فکر تھی کہ جائیں کہ نہ جائیں۔ اب یہ انتظار کہ گھر کب لوٹیں گے۔ ایسے آخر کب تک رہا جاسکتا تھا۔

یہاں جو کچھ مل رہا تھا۔ وہ روزمرہ کی بنیاد پر تھا۔ خوراک اور علاج مگر مستقل حل کوئی نہیں، مستقل حل سیاست کی نذر ہوجاتا۔ ووٹ بینک جیسے ادارے کی فائلوں میں دب جاتا اور امداد کے نام پر خلوص ہو یا چال بازی ڈھکوسلہ سب چند دنوں کا مہمان تھا۔ انسان تو نکمے ثابت ہوئے تھے، رہنما دھوکے باز۔۔۔ اور اوپر والا شاید خفا تھا، آزما رہا تھا، مینہ برس جاتا تو سارے مسئلے حل ہوجاتے۔

یہاں سب مل رہا تھا، تھوڑا یا زیادہ، خوراک، پانی، دوا۔۔۔ مگر مٹی کی نمک حلالی بے چین رکھتی، واپس کب جائیں گے۔ دن گزر رہے تھے، گھر یاد آنے لگا تھا۔ مگر امرکلا جیسے سکھ کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔

اس نئی دنیا کے سب رنگ انوکھے تھے۔۔۔ ہر پہلو نیا تھا، حیران کرتا۔

سب کو منرل واٹر کی بوتل لانا" دی جاتی۔ جیسے ہی امداد کی نئی کھیپ آتی۔ امرکلا نے جب بوتل سے پانی کا پہلا گھونٹ بھرا۔ وہ بری طرح چونکی۔ اس نے چونکنے انداز میں اگلا گھونٹ لیا، آنکھیں نچائیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور چلائی۔

"اس میں شہد گھول رکھا ہے۔"

اس نے زندگی میں پہلی بار پینے کا سادہ میٹھا پانی پیا تھا۔ ہاں بارش کے وہ قطرے اس پانی سے مشابہ تھے۔ جب برسات میں وہ منہ کھول کر زبان نکال کر آسمان کی

www.paksociety.com

جانب چرہ کرلیتی تھی۔ ان کا ذائقہ... کچھ ایسا تھا۔ وہ بوتل کو بار دیکھتی تھی۔

پہلی بار بوتل ملی تو شروع کے دو گھونٹ کے بعد بوتل سنبھال لی۔ اگر ختم ہو گئی تو... لیکن جب روز ہی ملنے لگی تو خدشہ ختم ہو گیا۔ سیر ہو کر پیتی پہلے کھسب سینت کر رکھتی تھی۔ اب بوتلیں سنبھالنے لگی۔ واپس جا کر پیا کرے گی۔ واپسی کے خیال سے اب دل بند ہوتا تھا اور وجوہات بہت سی۔

یہاں بسکٹ ملتے تھے اور چاکلیٹ یہ نام اور ذائقہ بھی پہلی بار چکھا۔

وہ لمبے لمبے سفید موٹے دھاگے بھی کھائے۔ جنہیں منہ کے اندر کھینچنا پڑتا تھا۔ شڑنگ کی آواز کے ساتھ سانس اندر لے کر۔

ایسا کھٹا میٹھا شربت بھی پیا، جو گتے کے ڈبے میں بند ہوتا تھا اور اس میں پتلا سا پائپ گھسانا پڑتا تھا۔ اسی شکل میں دودھ بھی ملتا تھا۔ مگر سب ذائقوں سے انجان تھر واسی اس دودھ پر ناک بھوں چڑھاتے کہ وہ اصل دودھ اور اصل ذائقے سے آشنا تھے۔ مجبوراً" پیتے۔ دودھ تو وہ ہوتا ہے، جو اپنے ہاتھ سے دوھ کر کچا بھی پی لیا جاتا ہے۔

رنگ برنگی ٹافیاں... چپس... چیونگم... ایسے ایسے ذائقے جو اس نے تو کیا اس کے باپ نے بھی کبھی نہیں چکھے تھے۔

امر کلا نے سورگ کی جھلک دنیا ہی میں دیکھ لی تھی۔ اب مرنے کا کس کا دل کرے۔

☼ ☼ ☼

اس دن ماں کے نوالے بناتے ہاتھ ٹھٹک کر رک گئے۔ بڑی بڑی بوٹیوں اور موٹے موٹے آلو والے چاول جن کا ذائقہ اور اشتہاء خود کر رہی تھی۔ وہ تیز تیز ہاتھوں سے بڑے بڑے لقمے حلق سے اتار رہی تھی۔ جبکہ ماں نے حلق میں اٹک جانے والے آنسو بمشکل نگلے تھے۔ باوجود ضبط کے آنکھ سے کچھ ٹپک ہی گیا۔ سسکی بھی نکل گئی۔

"کیوں روئی ماں! کیا ہوا؟" وہ اچنبھے سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"بوٹی نہیں ملی؟ لے میرے سے لے لے۔" اس نے فیاضی کی حد کر دی۔ یہاں آکر وہ کچھ خود غرض ہو چکی تھی۔ جہاں کھانے کی کوئی چیز ملنے لگتی۔ بھیڑ چیر کے سب سے آگے پہنچ جاتی اور اوڑھنی کے اندر ہاتھ رکھ کے شے کو کھاتی یا چھپا جاتی۔

"ہٹ..." ماں نے شدید ناگواری سے اس کا بڑھایا ہاتھ جھٹکا۔ "مجھ کو نئیں کھانی۔" ماں نے ناک سکوڑی۔ اسے بہت زیادہ رونا آرہا تھا۔ امر کلا کا چہرہ سوالیہ ہو گیا۔

"تو پھر روتی کیوں ہے؟ اب کیا دکھ..."

"کب بھگوان کی کرپا ہو گی اور ہم اپنے گھر کو جائیں گے۔ کتنے دن ہوئے میں نے اپنے ہتھوں سے ہانڈی چڑھائی ہو۔"

"تو شکر کر نا ماں! اس مصیبت سے جان چھٹ گئی۔ بیٹھے بیٹھے کھانے کو ملتا اے... اور کھانا بھی کیا سورگ کا... میں تو کہتی ہوں زندگی بس ایسے ہی گزرے..."

"آئے ہائے..." ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کو آگے ہوئی مگر وہ بھانپ کر پہلے ہی پیچھے سرک گئی تھی۔ شانے پر لگا۔ جیسے آگ ہی لگ گئی۔ "کالی جبان والی... کلموہی... چلولی چری۔"

ماں اسے تو پیٹ نہ سکی اپنے کلیجے پیٹنے لگی۔

"مارنے سے کیا ہو گا ماں... میں تو کہتی ہوں بس یہیں رہ جاؤں۔ تو ہی ہے جو واپس جانے کی بات کرتی ہے... اور ہے ہی کیا؟ دکھ تکلیف مشکل... بھگوان کرے میں تو اور رہ جاؤں ہمیشہ کے لیے۔" اس کا پورا وجود دعا بن گیا... ماں کو پتنگے لگ گئے، چمک کر بولی۔

"ہاں اور تیرا سسرال کا گھر بنے گا نا... ہمیشہ کے لیے۔"

"تو ماں! کیا نہیں بن سکتا... ماں! سچ تو میرا بیاہ بس اور کر دے۔"

"او" چھچھوری..." ماں نے چور نظروں سے اردگرد دیکھا۔ سب کھانے میں مگن تھے۔ "مگر کوئی

سن لے چھوکری اپنے منہ سے بیاہ کی بات کرے، لوئے اوئے..."

"اور کون تیرا ماسات رہتا ہے۔ یہ تو اوپر والے کا کرم ہے کہ گوتم اور افسر ہو گیا۔ ورنہ ماتھو اور بھی بکھ کرتے۔ یہ دور دور سے دوا کے لیے آتے ہیں۔ بکھ منجی تک نہ ملتی۔ پڑے ہیں کھلے آسمان کے نیچے... یہ تو ہے، جو بھر پیٹ سے گھومتی رہتی ہے۔ اور بی ایک تیمارداری کو دیکھتے ہیں۔"

ماں نے دکھی تلخ لہجے میں ساری کتھا کہہ دی۔ مگر اس نے سب سنا ہی نہیں۔ ماں کا ماسات کہنا دل میں گڑ گیا اور گوتم کا چہرہ آنکھ کے آگے پھرنے لگا۔ وہ اس سے پچیس چھبیس برس بڑا تھا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ باپو بھی تو ماں سے کتنا بڑا تھا نا، ماں کے سارے بال کالے اور باپو کے سر اور مونچھ پر جیسے کسی نے آٹا مل دیا ہو۔ کم از کم جب سے اس نے ہوش سنبھالا، باپو تو ایسا ہی ملا اور گوتم کے بال تو کالے تھے۔

"تو ماں! میرا بیاہ گوتم ہی سے کروے نا۔" ایسا موقع دوبارہ کب ملتا... ماں کے کان میں بات ڈال ہی دی۔

"اوئی..." ماں کی آنکھیں پھٹ پڑیں... "گوتم سے بیاہ..." اس نے ایک بار پھر ساتھ بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ سب کھانے کھلانے میں مگن تھے۔ ماں نے اس کا ہاتھ دبوچ کر اسے آگے کو گھسیٹا۔ منہ کے بل گرنے سے بمشکل بچی۔ ماں نے صرف ہاتھ دبوچا نہیں تھا۔ نوچا بھی تھا۔ سخت گرفت میں ساری تنبیہہ چھپی تھی۔

"او چری... وہ شادی والا آدمی... اپنا گھر سنسار... اب تو اوپر والے کی کرپا سے گود بھرنے والی ہے اور تو..." ماں نے ہاتھ چھوڑتے چھوڑتے بھی موٹی چٹکی کاٹ دی تھی۔

"ہاں تو وہی بات تو کرتی ہوں... اس کی پتنی تو مرنے والی ہے نا... تو پھر میرا بیاہ کر دینا بس۔" اس نے آسان حل بتا دیا۔ وہ تو جیسے سارا حساب کتاب لگائے بیٹھی تھی۔

"تت... تجھ سے کس نے کہا اے بھگوان!" ماں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"کس نے کہنا ہے، جب بچہ پیدا کرتے ہیں تو ماں تو مر جاتی ہے نا۔" اس کے سوال میں اثبات کا تیقن تھا۔

"تو جب بچہ پیدا کرتے وقت وہ مرے گی تو پھر بس..."

"کس نے بولا... بچہ پیدا کرنے سے مر جاتے ہیں۔"

"تو کیا نہیں مرتے؟" اس نے چمک کر پوچھا۔

"اور گوٹھ میں کیترائی زال مری... سمجھو جبی زال... ماسی جی ڈی... ہر روز بچہ ہوتا ہے تو ہر روز عورت مرتی نئیں کیا۔" ماں لاجواب ہو گئی۔

"اب کیا میں غلط بولی؟"

"اور شہر میں ایسا نئیں ہوتا۔ وڈا بہ وڈا اسپتال تیندا۔ کوئی بلی نئیں مرتا۔"

"تو گوتم کی پتنی مرے گی نہیں؟" ماں کے پر یقین قطعی اعلان نے اس کے خوابوں کا محل مسمار کر دیا۔

"نہیں مرے گی اور جو تو دوبارہ ایسی گالھ کی نا چری! تو میں تیری۔"

ماں نے پسلی کے گوشت پر ایک چونٹا بھرا اور کھا جانے والی نگاہ سے دیکھا کہ خبردار جو سسکاری بھی بھری ہو۔

"چری چھچھوری... باپو نے ایسے ہی نام امر کلا رکھا۔" ماں حسب حال نام بدل بدل کر رکھتی ہی رہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سب کچھ کھلا مل رہا تھا۔ لیکن جب انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ ہر جانب اجڑے بجڑے بھوکے، بیمار لوگ... اور میڈیا کا شور... اپنے اصل میں ڈھل کر سامنے آگیا۔ بے حد بھیانک روپ... بیماریاں، موت، ہنگامہ، مایوس لوگ...

منوں گندم بانٹ دی گئی۔ روزمرہ کی بنیاد پر خوراک فراہم کی جا رہی تھی۔ علاج کی ہر ممکن کوشش۔ ایک بستر پر چار، چار مریض، جسم غذائی قلت کا شکار تھے۔ پانی کی کمی نے جلد کو چٹخا دیا تھا۔ ڈرپیں لگائی جاتیں۔ مریض کو ڈرپ لگوانے کے بعد لیٹنے اور ڈرپ لٹکانے

کی جگہ نہ ملتی۔ وہ ڈرپ ہاتھ میں پکڑ نکل جاتا۔ ایک ہاتھ میں سوئی لگی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے ڈرپ کسی پیڑ سے ٹانگی اور سخت پتھریلی زمین پر لیٹ گیا۔ علاج مکمل ہے۔ ڈرپ بند کرنے کا طریقہ بھی پوچھ لیا۔ بعض خود سے سوئی بھی کھینچ لیتے۔

ہر روز انسان آرہے تھے بہت سی امیدیں لیے ہوئے مگر جو پہلے سے تھے' وہ بے زار ہوچکے تھے۔ کب تک یہ ہجرت۔۔۔ کب لوٹیں گے وہ اپنے گھروں کو۔۔۔ مدد کے لیے بہت سے لوگ فعال ہوچکے تھے۔ تنظیمیں' فلاحی ادارے' سیاسی ہرکارے۔۔۔ مگر یہ سب وقتی حل تھا۔ مستقل حل کی جانب کسی کا دھیان نہ تھا اور دھیان دلوایا جاتا تو سیاسی مصلحتیں حائل ہوجاتیں۔ کنوؤں کی کھدائی' واٹر بنانا۔۔۔ پانی کی لائنیں' ڈسپنسریاں' یہ سب طویل المیعاد منصوبے تھے۔ دور رس نتائج دینے والے' نگران پر دھیان دیتا کون ہے۔۔۔ وقتی ابال کو چولہا بند کرکے بٹھانے کے بجائے پھونکیں مار کے نیچے کردیا جائے تو بات سنبھلی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں یہی پھونکیں سب مار رہے تھے۔ ابال ٹھنڈا ہوجاتا۔ سب اپنے گھر کی راہ لیتے دینے والے بھی۔۔۔ اور لینے والے بھی' پھر بعد میں تھر واسی جانیں اور ان کا کام' سو سب سے آسان حل یہ ہی تھا کہ ڈور اللہ پر چھوڑ دی جائے۔ بارش ہوجائے اور سب کچھ پہلے جیسا ہوجائے' جیسا کہ تھر کے باسیوں کے لیے ہمیشہ سے تھا۔ سو ثابت ہوا کہ اگر بارش ہوجاتی ہے تو تمام مسائل ایک جھٹکے سے ختم ہوجائیں گے اور راوی چین کتھا لکھے گا۔ اربوں کی امداد لینے والی این جی اوز غائب تھیں۔ ہاں ہمیشہ کی طرح مذہبی تنظیمیں ہی مددگار تھیں اور خلوص سے کام کررہی تھیں۔

نماز استسقاء کا اعلان وارادہ سب کو بتایا۔

سب تھک چکے تھے اس صورت حال سے۔۔۔ ایک بارش کتنے مسائل کا حل بن کر آتی۔ جان چھٹ جاتی۔ دل کی گہرائیوں کے ساتھ' یقین کی آخری حد پر جاکر مانگی جانے والی دعا۔

کہتے ہیں دل جتنا دکھا ہوا ہو' طلب جتنی سچی اور یقین جتنا کامل۔۔۔ تو قبولیت کا عمل پلک جھپکتے جلوہ گر ہوجاتا ہے۔

صفیں بندھنے لگیں۔ جاء نماز اور چٹائیوں پر نمازیوں کی تعداد مکمل ہوگئی۔ یہاں ہندو اور مسلم سب اکٹھے تھے۔ کوئی پہچانا نہ جاتا تھا۔ ایک جیسی شکلیں اور حلیے اور بدحالی۔۔۔ مگر جب ایک ایک کرتے' وہ سارا میدان ایک صف ہوگیا تو ہندو واضح ہوگئے۔ چند مسلمان جو یوں ہی ذرا پرے وہ اب پہچان کے لیے صفوں میں آگئے۔ اتنے سارے انسان سجدہ ریز ہونے' گڑگڑانے' تڑپنے ملیامیٹ ہوجانے کے لیے' منانے کے لیے' معافی کے لیے رحم و کرم کی طلب میں صف بندی کررہے تھے۔

امرکلا کے گوٹھ میں مسلمان نہیں تھے۔ اس نے مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھا تو تھا' مگر اتنی بڑی تعداد میں سجدہ ریز انسان۔۔۔ ہندو نماز میں شریک تو نہیں تھے۔ مگر سناٹے کی ہیبت یکدم ہر ذی روح پر طاری ہوگئی۔

روتے بچے بھی چپ کرگئے۔ بھن بھن تک ختم ہوگئی۔ امرکلا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے' ماں نے گھرک کے اشارے سے چپ کروادیا۔ سب ہندو دور' دور الگ الگ کھڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر اس میدان کے گرد گھیرا سا ڈال کر کھڑے ہوگئے۔ دھیرے دھیرے سرکتے' عورتیں' مرد سب۔۔۔

"ہم کیوں آگے جارہے ہیں؟" اسے اعتراض ہوا۔ "یہ تو مسلے کرتے ہیں۔ پنڈت جی تھوڑی پراتھنا کررہے ہیں۔ یہ تو وہ مسلوں کا مولبی ہے۔ کہتا ہے اس نماج سے مینہہ ہوتا ہے۔ ماں! تو نے کیوں ہاتھ باندھے۔ سب نے ہی جوڑ لیے' کیوں ام کیوں؟"

ماں منہ سے کچھ نہ بولی' اس کی بانہہ پر اپنی کہنی ماری۔ "چپ رہ۔"

ماں نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں موندلی تھیں۔ اس کی پلکیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ مینہہ برسنے کی پراتھنا تھی۔ پر پہلے آنکھ برسنے لگی۔ اس نے امرکلا کو جواب دینے کے بعد اب کچھ نہ کہا۔ ایسی چپ تا پڑی تھی کہ حرف دعا بھول گیا۔ یا شاید اب لفظوں کی محتاج نہ تھی۔ رواں رواں دعا میں ڈھل گیا تھا۔

"ویروالا سب کا ہوتا ہے جری!"

"تو پھر کچھ مندر اور کچھ مسجد کیوں جاتے ہیں؟" اس کا ذہن ماں کے جواب سے الجھ گیا تھا۔

اوپر تپتا' ہٹ دھرم بے رحم' بے شرم سورج۔۔۔ نیچے گرم ٹیلے' ماٹی کے کڑاہے میں تپتی ریت' پیروں تلے بچھا دی تھی کسی نے۔۔۔ مولوی کی تکبیر کی آواز سب تک پہنچ رہی تھی۔ کئی ایسے تھے جنہیں خبر نہیں تھی۔ رکوع و سجود میں کیا پڑھتے ہیں۔ مگر وہ مسلسل جھک رہے تھے۔

ایک حالت تھی' وجد تھا' کیفیت تھی' یقین دعا۔۔۔ تکلیف اور بے بسی' بے بسی انتہا کی۔

امرکلا ہٹ دھرمی سے کھڑی رہی۔ وہ کیوں مسلوں کے اللہ سے مانگے۔۔۔ وہ دوران لڑکوں کو دیکھ رہی تھی جو سامان سے لدے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی آکر رکے تھے۔ امرکلا کو نت نئے ذائقوں کا چسکا لگ گیا تھا۔ ہر ایک دوسرے سے الگ اور لاجواب۔۔۔ ڈبے کے اندر مرغی کے ٹکڑے اور کوئلے کے جیسا شربت اس نے پہلے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ اسے بہت دور سے بھی نظر آرہا تھا۔ ایک ٹرک پر وہ کالا شربت بھی تھا۔

ٹرک رک گئے تھے۔ چھت پر سامان پہ چڑھ کر بیٹھے لوگ جست لگاکر اترے تھے۔ ڈرائیور ٹرک سے اتر آیا تھا۔ لیکن اتنے بڑے جم غفیر کو یوں گڑگڑاتا دیکھ کے وہیں رک گئے۔ امرکلا کو غصہ آنے لگا۔ سب جہاں کے تہاں رک گئے تھے۔ سارے کام ہی روک دیے گئے تھے۔ کچھ وہ لوگ جو انتظامی کام سنبھالتے تھے اور نماز میں شامل نہیں تھے۔ دعا مانگنے کے پل میں سر جھکا کر خاموش کھڑے ہوگئے تھے۔

دور پکتی دیگوں میں سے کسی کا ڈھکن اٹھا تھا۔ تان کی آواز کے ساتھ ہی خوشبو کا طوفان خالی معدوں کا امتحان بن گیا۔ لیکن دعا مانگتے یہ لوگ۔۔۔ اور یہ مولبی۔۔۔ بولتا ہی جاتا تھا' فضا کے سناٹے میں سسکیوں کی آواز اب ارتعاش کا باعث تھی۔ اتنے خاموش لوگ اور رو دیکھنے والا اوپر۔

امرکلا نے اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ ایک ساکت حالت میں تھی۔ مگر جسم لرزنے لگا تھا اور آنکھ بہنے۔ وہ تھک گئی۔ دیکھا دیکھی کے عالم میں اس نے پہلے ہاتھ جوڑے' پھر یوں ہی تجرباتی طور پر دعا کی طرح ہتھیلی پھیلائی۔ پھر جوڑی' پھر پھیلائی' آنکھیں موندلیں۔

دیگوں میں چلنے والے چمچے کی آواز ٹھن ٹھن تھی سسکیاں بین ڈالنے والے ماتم میں ڈھل گئیں۔ خاموش آنسو با آواز بلند بہنے لگے جیسے کئی دیگوں کے ڈھکن ایک ساتھ اٹھے ہوں۔

خاموشی کے اندر یہ شور دل چیر دینے والا تھا۔ محسوس کرنے کی چیز۔۔۔ سناٹا قائل کرتا تھا کہ ہے کوئی جو سب دیکھ رہا ہے اور جسے سب خبر ہے' جو آنا ہے۔ جو دلوں کے بھید جانتا ہے' کتنا سچ اور کتنا جھوٹ۔

امرکلا کے دل پر پہلی بار کچھ انہونی کا احساس ہوا۔ شاید ماحول حاوی ہورہا تھا۔ اسے اپنی ہتھیلی پر نمی کا احساس ہوا۔ تو کیا وہ رو رہی ہے مگر کیوں۔۔۔

اس نے چونک کر سختی سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رگڑے۔ آنکھیں تو خشک تھیں' پھر یہ اندھیرا سا کیوں چھانے لگا۔ اس نے انگلی کو ہاتھ پر مسلا۔ یہاں ابھی نمی تھی نا۔ ایک بار پھر دیگوں کے ڈھکن سرکائے گئے۔ ٹھن۔۔۔ اسے گال پر قطرہ گرنے کا احساس ہوا۔

اور ساتھ ہی بے پناہ شور۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ دیگوں کے ڈھکن کی ٹھن ٹھن نہیں تھی۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ بادل گرجے تھے۔ آنکھ میں کچھ پڑا نہیں تھا کہ دھند محسوس ہوئی تھی۔ آخر کار سورج ہار مان کے اوٹ میں چلا گیا تھا۔

ابھی نمازیوں کے سر سجدے ہی میں تھے۔ کئی ایسے تھے جو طویل دعا کے بعد نماز ختم کرنے کے بعد اٹھنے کے بجائے جیسے غش کھاکر دوبارہ سجدہ ریز ہوئے تھے۔

اللہ کو کیسے منائیں۔۔۔ بے بسی کی آخری حد۔

یہ اندھیرا بادلوں کی سیاہی کا تھا۔ جو بڑھ رہی تھی۔ امرکلا کے ہاتھ پر قطرہ آنکھ سے نہیں گرا تھا۔ یہ

اللہ کا کرم تھا۔ جو آسمان کا سینہ چیر کر بہہ نکلا تھا۔ وہ ایک قطرے کا اسرار کھوج رہی تھی۔

اس نے دوسرے قطرے کے گمان پر اپنا حق دق چہرہ آسمان کی سمت اٹھا دیا تھا اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کے چہرے پر جل تھل برسنے لگا۔ یہ قیامت کا پل تھا۔ انتظار کا پل 'نتیجے کا لمحہ۔

اٹھتے ہوئے نمازی۔۔۔ اللہ اکبر کی صدا لگاتے دوبارہ سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ وہ سمیع تھا اور رحیم تھا اور کریم تھا۔ بس ایسے ہی آہ و بکا کرتے رہے۔ ایک بار دل سے پکار کر تو دیکھتے 'یقین سے۔۔۔ بس ایک بار۔

یہ کیا ہوا تھا 'معجزہ۔۔۔ خدا کے وجود کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت۔

تھرواسی حیران تھے اور پھر خوف زدہ 'وہ سب چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھتے تھے مگر ایک تار کی بارش اتنی شدید تھی کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ تاحد نگاہ پانی کی دھند۔۔۔ پیروں میں لوٹتا پانی 'جسموں کو چومتا پانی 'سر پر برستا پانی 'تن من کو بھگوتا پانی۔

پانی آسمان سے ٹپک رہا تھا یا ساتھ ہی زمین سے بھی پھوٹ نکلا تھا۔ پہلے چیختی سالوں کی پیاسی زمین نے پانی کو اندر سمو کر اپنی پیاس بجھائی۔ پھر پانی انسانوں کے پیروں سے لپٹ گیا۔ پھر گھٹنوں تک چڑھ گیا اور اگر اسی طرح برستا رہتا تو۔۔۔

کہاں کہاں نہ جاتا 'سیرابی 'ہریالی 'زندگی۔۔۔ آہ۔۔۔

کچھ دیر پہلے انسانوں میں ایک تفریق تھی۔ کچھ جو سجدہ ریز تھے اور کچھ جو دور کھڑے تھے۔ مگر ایک لمحے کے زیر اثر آکر سب جھک گئے تھے۔ تفریق ان کی دنیاوی اور دینی حیثیت بتاتی تھی۔ ایک اللہ کو مان رہے تھے 'دوسرے متزلزل تھے۔

مگر۔۔۔

مگر بارش دونوں پر یکساں برسی تھی۔

وہ رب العالمین ہے۔ آخر یہ بات سمجھ کیوں نہیں آجاتی؟

وہ رب کائنات ہے۔

ہر جان دار بھیگ رہا تھا۔ مرجھائے چہرے کھلنے لگے تھے۔ تر سے ہونٹ سیراب ہوئے۔ ویران آنکھوں میں زندگی ناچنے لگی۔ ہر جان دار جھوم رہا تھا۔ اتنی بارش 'اتنی بارش جس نے ویرانے کو گل و گلزار کر دیا۔ جل تھل کر دیا۔ کنویں بھر گئے۔ جگہ جگہ پانی کے چھوٹے واٹر بن گئے۔ یہ سیرابی کا وقت تھا۔ صبح تک جگہ جگہ کیچڑ ہو گیا۔ تھرواسیوں نے اسے بھی خود پر تبرک کی طرح مل لیا 'چاٹ لیا۔

☆ ☆ ☆

امرکلا کی ماں کو جیسے سب سے زیادہ جلدی تھی گھر لوٹنے کی۔

ماں جلد از جلد سامان سمیٹ رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسے کوس رہی تھی۔

"اے موگو (کاہل سست) اے چری۔۔۔" مجال ہے جو وہ ذرا بھی ہلتی 'اس کا تو دل بند ہو رہا تھا۔ اتنا بڑا شہر چھوڑ کر واپس جائے۔۔۔ اس کے دل پر گھونسا پڑ رہا تھا۔ پھر کب ملے گا زندگی میں ایسا موقع۔۔۔ وہ مرے قدموں اور ٹوٹے ہاتھوں سے سب کے پیچھے گھسٹتی تھی۔ بہت دیر تک یوں ہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ مگر جب دیکھا کہ اٹھے بنا چارہ نہیں تو۔۔۔ اب وہ سامان سنبھال رہی تھی 'مگر صرف اپنا۔۔۔

پہلے مور اور دل کے کھمب سنبھالتی تھی۔ اب اس کا خزانہ کچھ اور تھا۔

کوک اور منرل واٹر کی خالی بوتلیں 'چپس 'بسکٹ اور کینڈیز کے خالی ریپرز۔۔۔ اسٹرا اور کچھ خالی ٹیٹرا پیک۔

نوجوانوں نے بوڑھوں اور بچوں کو کندھوں پر بٹھا لیا۔ کچھ بڑے لاٹھی ہاتھ میں لیے رہنما بن کر ابھرے جانوروں کو ہانکنے لگے۔ بوڑھی عورتیں اپنی لرزتی آواز میں کوئی لوک گیت گنگنا رہی تھیں۔ جانوروں کے گلے گھنٹیاں اور ہانکنے والوں کی آوازیں۔۔۔ رونق 'شور 'ہنسی۔۔۔ خوشی 'ایک ہی رات میں بارش کے ساتھ کیا سبزہ بھی پھوٹتا تھا۔ یہ کیسی تراوٹ تھی۔

مرد و زن کی شوخی کا کیا عالم۔۔۔ چھوکریاں جھینپ رہی تھیں۔ مینہ کے انتظار میں کتنوں کے بیاہ روک رکھے تھے تو اب شادیانے بجنے کا وقت تھا۔

امرکلا کے قدم سست تھے۔ وہ مڑ مڑ کر دیکھتی تھی۔ ہر اٹھتا قدم اسے مٹھی شہر سے دور لے کر جا رہا تھا۔ ہمیشہ کے لیے وہ سب سے آخر میں تھی۔ بیٹی کی سستی اسے ہمیشہ سے زہر لگتی تھی۔ اب اور بھی زیادہ۔۔۔ وہ رک کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

"اے موگو! تیرے پیروں میں کیا کنڈا چبھا ہے جو چلتی نہیں۔" ماں کی پھٹکار پر وہ خفا نہیں ہوئی۔ اپنی خالی اداس آنکھیں ماں کے چہرے پر ٹکا دیں۔

"اب ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھتی ہے؟ آگے چل۔ چپ کیوں ہے۔" ماں جھنجلا گئی۔

"ماں۔۔۔" وہ جو پوچھنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت تھی۔ اگر کسی کے کانوں پڑ جاتا کہ۔۔۔

"امرکلا! کیا چاہتی ہے 'کیا کہہ رہی ہے تو۔۔۔؟"

"آں بول۔۔۔ جلدی کر چھوکری!" ماں نے بڑھاوا دیا۔

"ماں! اب ام دوبارہ کب اور۔۔۔ مٹھی شہر آئیں گے؟"

"اے پاگل! ہمارا اور کیا کام۔۔۔ اوپر والے کی کرپا سے گھر جانے کو ہو گئے۔ ہمارا اور کیا کام۔۔۔ تجھے کیا بولنا ہے۔ اور رک کر کھڑی ہے 'سب آگے نکل گئے۔ میں نے مندر میں دیا بھی جلانا ہے۔ تیرے کو لے کر کھڑی ہوں اور اب تو یہ روتی کیوں ہے؟"

ماں بدمزا ہوئی۔ بیٹی کے چہرے کا سناٹا اسے چونکا رہا تھا۔ ورنہ وہ کہاں ٹھہرنے والی۔

امرکلا کچھ نہ بولی۔ وہ گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ شہری گاڑیاں 'امدادی ٹرک دوسری طرف کو لوٹ رہے تھے۔ واپسی کا سفر۔۔۔ وہ ادھر۔۔۔ یہ ادھر۔۔۔ دکھی سناٹے میں آئے چہرے پر بجی آنکھوں میں موت کی سی ویرانی تھی۔ پھر آنکھیں بہنے لگیں۔

"اب روتی کیوں اے بولتی کیوں نہیں۔" ماں کا لہجہ پریشانی میں ڈوبا۔

"ماں۔۔۔" اس کے حلق میں پھر آنسو اٹکے کیسے کہے جو سوال اٹک رہا تھا۔ قدم بڑھانے کی راہ میں حائل تھا۔

"تو مارے گی تو نہیں نا۔" اس نے پیش بندی ضروری سمجھی۔

"نہیں مارتی۔" ماں نے پچکارا۔ "تو بات کر 'اور جلدی کر۔"

"ماں یہ۔۔۔ ماں اب دوبارہ سوکھا کب پڑے گا؟"

ماں کے سر پر سے جیسے کسی گدھ نے پورا ماس نوچ ڈالا۔ سیکنڈ کے ہزارویں پل میں اسے بیٹی کے دل کی خبر ہو گئی۔ اس کے پلاسٹک کے بورے سے تھیلے سے جھانکتے ریپرز 'بوتلیں۔۔۔

"تیرے پربھگوان کا۔۔۔" اس نے بددعا دانتوں میں روک لی 'مگر ہاتھوں کو نہ روک سکی۔

امرکلا پٹ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے ماں اسے کوٹ رہی تھی۔ اس کے بال نوچ رہی تھی۔ اس نے اسے زمین پر گرا دیا۔ اور چڑھ کر مارنے لگی جیسے۔ بچانے والے پوچھ پوچھ تھک گئے۔ ماں کیا جواب دیتی۔ پیٹنے سے فرصت ملتی تو بولتی 'بس یہی کہتی تھی۔

"ارے چری۔۔۔ ارے اور چھوکری۔۔۔ پاگل!"

☆